ترقی پسندی اور جدیدیت

ڈاکٹر اطہر سلطانہ
اسوسی ایٹ پروفیسر
و صدر شعبۂ اُردو تلنگانہ یونیورسٹی

☆☆☆

ڈاکٹر اطہر سلطانہ
اسوسی ایٹ پروفیسر
و صدر شعبۂ اُردو تلنگانہ یونیورسٹی

ترقی پسندی اور جدیدیت

یوں تو اُردو ادب میں نئے رجحانات کی ابتداء انیسویں صدی کے آخری حصے اور بیسویں صدی کے اوائل میں ہوگئی تھی۔ انیسویں صدی کے آخر میں انگریزوں کا ہندوستان پر باقاعدہ تسلط ہوگیا تھا، جس کی وجہ سے ہندوستان ایک نئی کشمکش میں مبتلا تھا۔ انسانی زندگی بے اوقات ہوکر رہ گئی تھی۔ زندگی کی جیسی بے قدری اس دور میں ہوئی اس کی مثال ہندوستان کی تاریخ میں ملنا مشکل ہے۔ پرانے عقیدوں اور رجحانوں پر سے یقین اٹھ گیا تھا اور عوام نئے عقیدوں، قدروں اور رجحانوں کے لئے کوشاں ہوئے۔ لہذا ایک طرزِ حیات میں آئی وہیں اس زمانے کی تہذیب اور روایات کی کشمکش، نئی زبان نئی تہذیب اور نئی باتوں کو قبول یا رد کرنے کا مسئلہ۔ اس کے ساتھ ہی متوسط طبقے کی حالت بھی دن بہ دن خراب ہوئی جارہی تھی جس کے لئے سرسیدؔ، حالیؔ، مولانا محمد حسین آزادؔ، شبلیؔ نعمانی اور ذکا اللہ وغیرہ نے نئی باتوں کو اپنانے کی تحریک شروع کی۔ انہوں نے اپنے تحریروں اور تقریروں کے ذریعے نئے علوم اور نئی تہذیب کی حمایت کی اور اس کے زیر اثر اس زمانے کے ادب میں بھی تبدیلی کے نمایاں اثرات دیکھے گئے تھے۔ اس جدید نقطہ نظر کی تلاش ''رومانی عقلیت'' کا نام دیا گیا تھا۔

اس کے بعد اُردو ادب میں جو سب سے اہم ادبی تحریک ملتی ہے۔ وہ ہے ترقی پسند تحریک۔ یہ تحریک دراصل اس زمانے کے مطابق اور حالاتِ حاضرہ سے متاثر ہوکر وجود میں آئی۔ ۱۸۵۷ء کے انقلاب کے بعد جو آزادی کی پہلی لڑائی کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ ہندوستانی عوام میں بے چینی وانتشار کا ماحول تھا۔ اور عوام امید و یاس کے دور سے گذر رہی تھی اس انقلاب نے ایک سیاسی بساط الٹ دی تھی۔ اسی کے ساتھ ساتھ ہندوستان میں انگریزوں کی بدولت صنعتی انقلاب اور تعلیم کے میدان میں جدید علوم سے آگہی کی بدولت عام ہندوستانی کا ذہن ایک نئی فکر اور ایک نئے میعارِ زندگی کی طرف بڑھ رہا تھا اس تحریک

کی فضا دراصل ۱۹۳۶ء سے قبل ہی باقاعدہ طور پر شروع ہوئی لیکن دراصل یہ تحریک اس وقت وجود میں آئی جب کہ فاشزم آگے بڑھ رہا تھا۔ان سب باتوں اور محرکات کا اثر ان ذہین اور تعلیم یافتہ نوجوانوں پر پڑا جو پیرس میں مقیم ادیب وشاعر تھے۔ان میں خاص نام سجاد ظہیر، ملک راج آنند، جیوتی گھوش، محمد دین تاثیر اور پرمود سین گپتا وغیرہ ہیں۔مغرب کی ترقی پسند سرگرمیوں سے متاثر ہوکر ان نوجوانوں نے ایک انجمن کی بنیاد ڈالی، جس کا نام ''ہندوستانی ترقی پسند ادیبوں کی انجمن'' رکھا گیا تھا۔اس انجمن کے مقاصد اور دوسرے عوامل پر لمبی لمبی بحثیں بھی ہوئیں۔اور باقاعدہ اس انجمن کی میٹنگیں ہونی لگی، لیکن ساتھ ہی ان نوجوانوں کو اس بات کا بھی احساس ہونے لگا تھا کہ وہ ملک سے باہر رہ کر کوئی ادبی کارنامہ انجام نہیں دے سکتے ہیں ۔ایک مستودہ تیار کر کے ہندوستان کے مختلف ادیبوں اور شاعروں کو بھیجا۔سب سے پہلے جس شخص نے اس کو سراہا وہ پریم چند تھے۔ان ہی کی صدارت میں ہندوستان میں ترقی پسند مصنیفین کی پہلی کانفرنس ۱۹۳۶ء میں بمقام لکھنؤ میں منعقد ہوئی۔ دراصل اُردو ادب میں اس تحریک کی بنیاد یہ کانفرنس تھی۔جس میں نئے اور پرانے سب ہی ادیبوں نے شرکت کی۔اور چونکہ اس کانفرنس میں پریم چندؔ، رویندر ناتھ ٹیگورؔ، حسرت موہانی، جوشؔ ملیح آبادی اور قاضی عبدالغفارؔ جیسے مستند ادیبوں اور شاعروں کی تائید اور سرپرستی حاصل تھی تو دوسری طرف سجاد ظہیر، احمدؔ علی، ڈاکٹر اعجازؔ حسین، فیضؔ احمد فیض، احتشامؔ حسین، ڈاکٹر تاثیرؔ خواجہ احمد عباسؔ کرشنؔ چندر، منٹوؔ، اور مجازؔ جیسے بعد کے نوجوان ادیب اور شاعر اس کے ہم نوا تھے۔اس لئے یہ تحریک تھوڑے ہی عرصے میں ملک کی ساری ادبی فضا پر چھا گئی۔ چونکہ پریم چند کا خطبہ صدارت جو انہوں نے پہلے اجلاس میں پڑھا تھا ایک نئے موڑ کا نشانِ راہ قرار دیا جاسکتا ہے۔ جہاں اس نے انجمن ترقی پسند تحریک کے کو ایک نئی راہ دکھائی وہاں ادب کے مقاصد اور زندگی سے اس کے تعلق پر بھی زور ڈالا اور اپنے خطبہ کا اختتام ان الفاظ پر کرتے ہیں۔

> ''ہماری کسوٹی پر وہ ادب کھرا اترے گا جس میں تفکر ہو، آزادی کا جذبہ ہو، حسن کا جوہر ہو، تعمیر کی روح ہو، زندگی کی حقیقتوں کی روشنی ہو، جو ہم میں حرکت، ہنگامہ اور بے چینی پیدا کر کے سُلائے نہیں کیونکہ اب زیادہ سونا موت کی علامت ہوگی''۔[1]

یہ چند الفاظ ترقی پسند کا پورا تجزیہ کرتے ہیں اور یہ تحریک زندگی کو ادب سے نزدیک لائی اور اس کے ذریعے

---

[1] بحوالہ (مشمولہ) خلیل الرحمٰن اعظمی۔ از ''اُردو میں ترقی پسند ادبی تحریک'' صفحہ نمبر ۴۵۔ ۱۹۸۴ء۔

مصنفیں وشعراء نے زندگی کے ان مناظر پر بھی نظریں دوڑائیں جن کی طرف دیکھنا لوگ پسند نہیں کرتے تھے۔ یعنی غریبوں کی حمایت اور مزدوروں کی جدو جہد میں جدو جہد میں ساتھ دینے کا جذبہ، ملک کو سامراجی قوتوں سے مقابلہ کرانے کا حوصلہ اور آزادی کا جذبہ ان ہی ترقی پسندوں نے ادب کے ذریعے تمام ملک میں پھیلایا اور آگے بڑھایا تھا۔ مزدوروں، کسانوں اور تمام مظلوم انسانوں کی طرف داری کی ذمہ داری انہوں نے اپنے کاندھوں پر اٹھائی وہ عوام کے ساتھ مل کر عوام کی آواز میں آواز ملا کر گیت گانے لگے۔ ڈھکا چھپا اظہار بیان نہیں تھا بلکہ وضاحت تھی، اجتماعیت تھی۔ چونکہ ترقی پسندوں کے مخاطب غریب اور مزدور طبقہ کے لوگ تھے، جو زیادہ پڑھے لکھے نہں ے لہذا انہوں نے سادہ وسلیس زبان کا استعمال کیا اور وضاحت سے کام لے کر لوگوں کے دلوں میں محبت، ہمدردی، بھائی چارگی اور مساوات کے پیغام پہنچائے، اور چونکہ یہ وقت کی آواز تھی لہذا اس آواز پر ہر شخص نے لبیک کہا۔ علی سردار جعفری لکھتے ہیں:

> ''ادب کا تناور درخت جو شاعروں اور ادیبوں کی ذہنی فضاء میں پھلتا پھولتا ہے اپنی جڑوں کی آبیاری کے لئے عوام کے دماغوں کا محتاج ہوتا ہے۔ اس لئے عام زندگی سے ادب کو الگ نہیں کیا جا سکتا'' [1]

ان ترقی پسندوں نے افسانے، ناول، شاعری اور تنقیدی بصیرت کو بھی عام کیا۔ ادیبوں میں خاص کر کرشن چندر، سعادت حسن منٹو، راجندر سنگھ بیدی، حیات اللہ انصاری، علی عباس حسینی، عصمت چغتائی، احمد ندیم قاسمی، عزیز احمد خواجہ احمد عباس اور غلام عباس وغیرہ ہیں۔ ان افسانوں میں انہوں نے زندگی کے مختلف واقعات، جن کا تعلق موجودہ دور سے تھا جو سیاسی وسماجی صورتِ حال، آزادی کے جذبے، مساوات اور بھائی چارے کا درس دیا ان ادیبوں کے علاوہ شعراء نے بھی بڑے پیمانے پر اس تحریک سے متاثر ہو کر اپنی تخلیقات کو نئی منزلوں اور نئے رجحانات سے روشناس کرایا۔ ان ترقی پسند شاعروں میں خاص نام جوش ملیح آبادی، سردار جعفری، مخدوم محی الدین، مجاز، جاں نثار اختر جذبی، ساحر لدھیانوی، فیض احمد فیض، احمد ندیم قاسمی، فراق گورکھپوری، مجروح سلطان پوری اور کیفی اعظمی کے ہیں۔ یہ شعراء اس زمانے کے ماحول اور سیاسی سماجی پس منظر سے متاثر تھے۔

ترقی پسند ادیبوں وشاعروں نے ترقی پسند ادب میں زندگی کا ایک وسیع نقطہ نظر پیش کیا۔ ذات پات کی تفریق اور رنگ ونسل کے تعصّبات کو مٹا کر انسان کو ایک کل کی حیثیت سے پیش کرنے کی کامیاب کوشش

---

[1] علی سردار جعفری نیا ادب ۱۹۳۹ء/ اپریل

کی۔ نامساعد حالات کے ساتھ نبرد آزما ہونے ،فرسودہ رسم ورواج کوتوڑنے، ناقص اور نامناسب سماجی نظام تبدیل کرنے اور زندگی کو بہتر بنانے کی سعی پر زور دیا۔اوراس کے علاوہ ان ادیبوں اور شاعروں نے ملکی اور قومی مسائل کے ساتھ ساتھ بین الاقوامی مسائل پر بھی توجہ مرکوز کی۔ بلاشبہ یہ ایک نئی اور عہد آفرین تحریک تھی۔جس نے اُردو ادیبوں اور قارئین کو شدت سے متاثر کیا۔اس لحاظ سے اُردو ادب کی تاریخ مں ے اس تحریک کے بہت سے اسباب ہوسکتے ہیں۔اس تحریک نے ادب میں تجربات کی نئی راہیں کھولیں اوران تجربات کو اعتبار بخشا، اس نے ادب اور زندگی کے رشتے کو استوار کرکے ادب کے افق کو ایسی وسعت دی کہ اس میں سارا جہاں سمٹ آیا۔زبان کے بندھے ٹکے ڈھانچے اور اسلوب واظہار کے طریقوں کوتوڑ کر جذبے، تجربے اور محسوسات کو بیان کرنے کے نئے انداز پیدا کئے۔اس نے جمالیات کی نئی تشریح وتعبیر کی۔اس نے قصہ گوئی اور داستان خوانی کے قدیم پتھروں سے افسانے کے جوہر تراشے،اس نے سماجی علوم کے دروازوں کو ادب پر وا کرکے عصری بصیرت اور علمی افکار سے ادب کا رشتہ جوڑا،اس نے خواب وخیال کے طلسم سے ادب وشاعری کو باہر نکالا۔ یہ اور ان جیسی بہت سی باتوں میں ترقی پسند ادبی تحریک کو اولیت حاصل ہے۔

ترقی پسند ادبی تحریک نے ادب کی تعریف وتفہیم،مواد وہئیت کے رشتے، رمزیت واشاریت،حقیقت نگاری،ادب وسماجی ،اجتماعیت وانفرادیت اور اظہار واسلوب کے مسائل پر جس بحث کا آغاز کیا وہ اس بناء پر اہم ہے کہ ادب کے مسائل پر اس وسیع تناظر میں اس سے پہلے گفتگو نہیں ہوئی تھی۔اس تحریک نے اس میں ادیب وقاری اور نقاد سب کو شریک کرکے تنقیدی شعور اور بصیرت پر جلا کی اور فکری وادبی مسائل پر غور وخوص کی ابتداء کی ،جن سے ادب میں نئی تجربات کے لئے راہ ہموار ہوئی۔اس تحریک کا سب سے بڑا کارنامہ دابی تنقید ہے۔جب کہ اس سے پہلے تنقید فصحاء اور ماہرین علم بدیع وبیان کا نام تھا۔تذکروں سے جو تنقید ہمیں وراثت میں ملی تھی اسی کو سب کچھ تنقید کا میعار مان لیا کرتے تھے۔حالانکہ اس میں تنقید کم، رائے زنی ،نکتہ چینی اور لفاظی زیادہ تھی، اور اس کا انحصار ذاتی پسند وناپسند پر تھا۔لیکن جب ترقی پسند تحریک اُردو ادب میں ابھرتی تو پہلی بار ادبی تنقید کو ایک نیا ذہن اور میعار عطا ہوا اس سلسلے مں ے اطہر نبی لکھتے ہیں:

> ’’ترقی پسند تحریک نے لوگوں مطالعے کا شوق دلایا، اور آج لوگ تنقیدیں بھی ذوق وشوق سے پڑھنے لگے۔اس نے تنقید کو محض لفظی یا شعبدہ باز ہونے سے بچایا۔۔۔۔۔۔۔۔ اس نے تحسین اور سخن فہمی کا میعار انچا کیا۔۔۔۔۔اس نے آزاد نظم ، بے قافیہ نظم اور اس قسم کے دوسرے

تجربوں کے لئے میدان صاف کیا ۔۔۔۔۔ اس نے ہمارے ادب کو عصریت اور ارضیت عطا کی اور ماضی کی نئی پہچان میں حصہ لیا۔۔۔۔۔۔ اس نے تجربے اور تجربے میں فرق کرنا سکھایا۔ اس نے تنقید کو تخریب جوئی یا نکتہ چینی نہیں ہونے دیا۔ اس نے بتایا کہ تنقید محض گلستان میں کانٹوں کی تلاش نہیں بلکہ کانٹوں کے باوجود بہار کا احساس رکھنے کی کوشش ہے۔ یہ تنقید ذہنی صحت کا میعار قائم کرتی ہے اور تجربے کی قدر و قیمت متعین کرتی ہے'' [1]

''ترقی پسند تحریک نے شاعری اور افسانہ نگاری کے علاوہ اُردو زبان کے جس شعبے کو سب سے زیادہ متاثر کیا وہ ''ادبی تنقید ہے اگر یہ کہا جائے تو کچھ بے جا نہ ہوگا کہ اس تحریک کی بدولت اُردو تنقید کو ایک نیا ذہن، ایک نیا مزاج اور ایک منفرد کردار نصیب ہوا'' [2]

کوئی بھی فن پارہ ہر عہد میں یکساں کیفیت اور تاثر کا حامل نہیں ہوتا۔ اس کا جمالیاتی خط اور تاثر محدود ہوتا ہے۔ دوسرے عہد کے لوگوں کو اس میں خاص کیف و تاثر اس صورت میں حاصل نہیں ہوگا جو اس کے عہد کے تخلیق کے لوگوں نے حاصل کیا۔ اس کے ساتھ ہی کچھ لوگ ادب کی عصر پر زور دیتے ہیں، یعنی فن کار اپنی تخلیق صرف خلا میں نہیں کرتا بلکہ اس کی تخلیقات ان ہی روایات اور سماجی ماحول سے وابستہ ہوتی ہیں۔ جس میں وہ سانس لیتا ہے اور جن حالات سے اس کی زندگی دوچار ہوتی ہے اس کے نقوش خیالات کے ذریعے ادب میں بھی دکھائی دیتے ہیں۔ یہ ایک بدلتے ہوئے سماج اور نئی زندگی کا نوحہ ہے۔ جس کی وجہ سے آزادی کے بعد کی شعری و ادبی روایات میں نمایاں تبدیلی آئی اور ترقی پسند تحریک سے اگل ایک رجحان پیدا ہوا۔ جس کی آواز دل کے نہاں خانوں سے آتی ہے، یہ اندرونِ ذات کی کہانی ہے جس کو آج کا شاعر آج کے معاشرے کے پس منظر میں تخلیق کر رہا ہے۔ ادب کے تخلیقی کارنامے ان حقیقتوں کا عکس ہوتے ہیں، جو سماج میں پائی جاتی ہیں، لوگ انفرادیت پر زور دینے لگے اور سماجی عوامل و حالات کے اثرات کی اہمیت کم ہونے لگی۔ اس ردِّ عمل کی شدّت رفتہ رفتہ کم ہوتی گئی۔ اس کی سب سے زیادہ شدید شک ۱۹۵۵ء تا ۱۹۶۰ء اور ۱۹۶۰ء سے ۱۹۷۰ء تک اُردو ادب میں جدیدیت کی شکل میں نظر آتی ہے۔

---

[1] پروفیسر آل احمد سرور ترقی پسند تحریک پر ایک نظر ترقی پسند تحریک مرتب۔ اطہر نبی صفحہ نمبر ۱۳۹ تا ۱۴۰۔

[2] خلیل الرحمٰن اعظمی، مضمون ''ترقی پسند تنقید'' (مشمولہ) اُردو میں ترقی پسند ادبی تحریک صفحہ نمبر ۲۴۳/

''جدیدیت'' کا رجحان سب سے پہلے مغرب میں اُبھرا۔ وہاں اس کے فروغ پانے کے مخصوص سیاسی وسماجی وجوہات تھیں۔ خاص طور پر پہلی جنگ عظیم سے جو جانی ومالی تباہیاں ہوئیں اس کا اثر ایک لمبے عرصے تک رہا۔ اس مایوس کن عہد نے ادبی فن کاروں کو بھی جھنجھوڑ دیا۔ انہیں اس بات کا احساس ہوا کہ ان کی سیاسی ،تہذیبی، سماجی اور ادبی اقدار ختم ہونے لگیں، لہذا عدم تحفوظیت کا احساس اور بے یقینی و بے اطمنانی نے سر اٹھایا۔ قومیت پرستی کا تصور بھی بے جان ہوگیا جمہوریت اور انسانی دوستی سے بھی لوگوں کا اعتماد اٹھ گیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ادب میں اجتماعیت کے جبائے انفرادیت پر مور دیا جانے لگا۔ مادیت کے بجائے روحانیت کی طرف توجہ دی جانے لگی۔ فرائیڈ کے نفسیاتی نظریات عام ہوئے، اور ایک نمایاں تبدیلی شعروادب میں آئی۔ ہندوستان میں ''جدیدیت'' کے ابھرنے میں کچھ وقت لگا۔ اس کی وجہ سے کہ ہندوستان میں ترقی پسند ادبی تحریک کا زور تھا یہ تحریک زمانے کے موافق تھی اور اس میں ملک کو آمادی دلانے کا جذبہ خاص تھا۔ لیکن آزادی کے بعد ماحول یکسر بدل گیا، سیاسی وسماجی حالات بھی بہت حد تک بدل گئے لہذا ادب کے تخلیقی کارناموں پر بھی بہت گہرا اثر پڑا۔ آل احمد سرور اپنے ایک مضمون میں لکھتے ہیں:

> ''ہمارے ادبی شعور کو اور زیادہ جدید، زیادہ سنجیدہ، زیادہ مغربی اور زیادہ بیدار ہونا چاہئیے ۔لیکن مغربیت اور جدیدیت پر وزور دینے سے مراد یہ نہیں کہ ہم اپنے ماضی کے عظیم الشان کارناموں کو نظر انداز کریں۔ اپنے ادب کے ہندوستانی اور مشرقی مزاج کو بھول جائیں۔ نیا ادب نئی اور صاف سلیٹ پر نہیں لکھا جاتا۔ یہ تہذیبی سرمائے اور تمدنی میراث سے بے نیاز نہیں ہوسکتا۔'' [1]

چونکہ کہ ترقی پسند تحریک نے آزادی کے بعد اشتراکیت کا اعلان کھلے ڈھنگ سے کر رہی تھی جس سے اس تحریک کی نوعیت سیاسی ہوگئی تھی لہذا نئے شاعروں نے ترقی پسند موضوعات کو چھوڑ دیا اور اس کی جگہ فرد کی تنہائی ، درد و کرب ذات کے المیئے اور اندرونِ ذات کے موضوعات کو اپنایا۔ جدیدیت کے مخصوص موضوعات کے بارے میں شمیم حنفی لکھتے ہیں:

> '' زندگی کی خواہش اور زندگی سے بیزاری کا احساس، بے چارگی اور نامرادی کے حوصلہ شکن تجربے اور علم کی پیاس بجھانے کے لئے کائنات کی

---

[1] آل احمد سرور۔ نئے اور پرانے چراغ صفحہ نمبر ۲۸۱

تسخیر کے منصوبے، دنیا سے دوری کا خیال اور ایک نئی دنیا کی تعمیر کا خواب، حال سے پابستگی اور ماضی کی بازدید کا جذبہ اور مستقبل کے امکانات کی جستجو، تھکن اور لاحاصلی کا کرب اور ان دیکھی منزلوں کی تلاش، فطرت کے ہر بھید کو تعقل کی روشنی سے بے حجاب کرنے کی ہوس اور ایک گونہ بے خودی کا شوق'' [1]

''جدیدیت'' ہے کیا چیز دراصل اس موضوع پر اس زمانے میں اس کی تائید و تردید افہام و تفہیم، وضاحت وحد بندی سے متعلق کثرت سے بحثیں ہوئیں اور مختلف ادیب و شاعر مختلف طور سے اس کی تعریفیں باندھی لیکن پھر بھی ''جدیدیت کے تعلق سے کوئی جامع اور مانع تعریف مشکل ہے۔ لیکن اتنا تو ضرور کہا جاسکتا ہے کہ یہ روایت سے ہٹ کر ایک الگ شئے نہیں ہے لیکن پھر بھی ہر دور کی اپنی مخصوص روایت ہوتی ہیں۔ ادبی روایت کے سلسلے میں تو یہ بات واضح ہے کہ ہر فن کار اپنے فن کارانہ آغاز سفر میں کسی بھی روایت کا سہارا لیتا ہے۔ یعنی پچھلے زمانوں کے بنائے ہوئے سانچوں کو، اسالیب کو، اپنی تخلیقات میں جگہ دیتا ہے۔ اس کی یہ تخلیقات ایک طرح سے معاصرین یا پھر متقدمین کی بازگشت ہوتی ہے۔ اس کے بعد اس کا اپنا شعور جاگتا ہے۔ جو اس کی عقلیت اور تقلید کو روکنے کا سبب ہوتا ہے یہاں سے وہ ایک الگ راہ اختیار کرتا ہے۔ اس کا اپنا رنگ و آہنگ ہوگا اس میں پرانا پن بھی ہوگا اور نیا پن بھی۔ اس سلسلے میں یہاں جمیل جالبی کا بیان بے محل نہ ہوگا ملاحظہ کیجئے:

''جدیدیت کے سلسلے میں ایک بات تو میرے ذہن میں یقینی طور پر آتی ہے کہ ''جدیدیت'' ایک اضافی چیز ہے۔ وہ چیز جس کا تعلق کسی لمحہ کسی خاص زمانے یا دور سے ہوگا وہ اضافی ہوگی۔ مطلق نہیں، اس اعتبار سے جدیدیت کی کوئی ایسی تعریف نہیں کی جاسکتی جو دس سال بعد بھی صحیح و درست ہو، آج کی جدیدیت کل پرانی ہوجائیگی جو آج جدید ہے وہ کل قدیم ہوجائے گا۔ ان ہی معنی میں ہر جدید میں قدیم مشترک رہتا ہے اوایت کے بھی یہی معنی ہیں۔۔۔۔۔ ماضی اور اس کے وہ ادب پارے جن میں اسے اپنے طرز احساس، انداز فکر کا شعور اور عکس نظر آتا ہے وہ اپنے سینے سے لگا کر اپنے

---

[1] شمیم حنفی۔ جدیدیت کی فلسفیانہ اساس۔ دوسرا باب۔ صفحہ نمبر/۱۰۸

معیاروں کے پیش نظر انہیں نئے معنی دے دیتی ے،اور باقی کو رد کر دیتی ہے فکری سطح پر دھوپ چھاؤں کا یہ کھیل ہمیشہ جاری رہتا ہے۔ان معنی میں ہم ہر نسل کے ایسے میعاروں اور پیمانوں کو،جن سے وہ اپنے دور اور ماضی کو دیکھتی اور ناپتی ہے،ہم ''جدیدیت'' کا نام دے سکتے ہیں۔۔۔۔۔۔ایک زمانے میں ''جدیدیت'' سرسید تحریک کا نام تھا۔گویا وہ انداز نظر اور وہ رویہ جس سے سرسید نے اس قوم کے حال اور ماضی کو سمجھنے اور سمجھانے کی کوشش کی اور جس کی مدد سے اس قوم کا احیاء ممکن ہوسکا۔ ۱۹۰۲ء کے قریب ٹیگوریت اور رومانی تحریک جدیدیت کے مترادف تھی ۔ ۱۹۳۶ء میں ''جدیدیت'' ترقی پسندی کا نام تھا۔۱۹۴۷ء کے فوراً بعد اجتماعی شعور کا اظہار نئی غزل کے روپ میں جدیدیت کہلاتا تھا۔لیکن آج ۱۹۶۸ء میں ہم ان میں سے کسی کو بھی ''جدیدیت'' کہہ سکتے ہیں: اگر اس کا جواب نفی میں ہے تو اس سے اس بات کی تصدیق ہو جاتی ہے کہ ''جدیدیت'' ایک اضافی چیز ہے،جس کے معنی ہر نسل کے سات ہر دور میں بدل جاتے ہیں اور اسے زمانۂ مستقبل میں پھیلانا ایک بے معنی بات ہے'' [1]

انفرادیت، جدت اور بغاوت یہ تین امتیازات روایت اور جدیدیت کے درمیان واضح طور پر دیکھے جاسکتے ہیں۔جدّت محض کسی فنی چیز کا اختراع نہیں بلکہ یہ تخلیق کار کی اعلیٰ صلاحیتوں کا اپنے فن میں فن کارانہ اظہار ہے۔دارصل جدّت کسی مانوس شئے یا جس کو ہم اپنے تخلیق کار رنگ دینا چاہتے ہیں اس پر ہمدردانہ غور اور مطالعہ اور اس کے مخفی گوشوں اور اس کے امکانات کی تلاش کا نام ہے۔ یہ ایک بہت ہی دلکش عمل ہے، اس میں تحیر اور استعجاب بھی ملے گا۔تخلیقی علم جب اپنی فطری صلاحیت سے دوچار ہوتا ہے اور روایت نئے تجربوں میں ڈھل کر اپنا نیا رنگ جماتی ہے تو اسے ادبی روایت سے بغاوت کا نام ملتا ہے۔ادب چونکہ انفرادی تجربے اور تخلیق سے عبارت ہے۔اگر ادیب اپنی شخصیت کے ساتھ ایمان دار ہے،اپنی انفرادی زندگی اور تجربوں کے ساتھ مخلص ہے تو وہ کبھی بھی اپنے عہد کے مطالبات سے دامن چرا سکتا ہے نہ آنکھ چرا سکتا ہے۔دراصل ہم ان ہی شعراء وادیب کو جدید کہہ سکتے ہیں جنہوں نے آج کی حقیقت کا شاعرانہ

---

[1] جمیل جالبی،ڈاکٹر۔''جدیدیت کیا ہے۔'' مشمولہ ۔نئی تنقید۔مرتبہ۔خاور جمیل۔صفحہ نمبر/۸۰ ۱۹۸۸ء

ادراک حاصل کیا اور جدید احساس کے مطابق ان کا اظہار کیا ہے اور ان کے ہاں ترقی پسندی کے لہجے کا اثر بھی ہے اور جدید حسّیت کا بھی، صحت مند جدیدیت، ترقی پسندی کی مخالف نہیں ہے بلکہ ترقی پسندی کی توسیع ہے۔ جدیدیت کا تصور اتنا پیچیدہ اور مختلف ومتضاد عناصر سے مرکب ہے کہ اس کی کوئی جامع تعریف نہ ہوسکی۔ مختلف الخیال اور مختلف العقائد کے شعراء وادیب کے خیالات ونظریات میں سب سے زیادہ اہم بیان دراصل وحید اختر کا ہی ہے:

> ''جدیدیت کے مفہوم کے تعین کے لئے ہر عہد کے مخصوص حالات اور نظام اقدار کو بھی پیش نظر رکھا جائے۔ اپنے عہد کی حقیقی زندگی اور اس کے امکانات کو معیار بنا کر ہی ''جدیدیت'' کا مفہوم متعین ہوسکتا ہے۔ ''جدیدیت'' کوئی قطعی، مستقل، مکمل اور جامد تصور نہیں۔ یہ ایک تخلیقی عمل ہے جس میں زمانہ اور انسان برابر کے شریک ہیں۔ ''جدیدیت'' وسیع تر مفہوم میں ایک مسلسل عمل ہے، ''جدیدیت'' ادعائیت سے ہمیشہ ہر سر پیکار رہتی ہے۔۔۔۔۔۔ جدیدیت کی تفسیر ممکن ہے۔ ادب میں جدیدیت کسی باضابطہ تحریک لائحہ عمل یا منشور کے تابع نہیں بلکہ اس کی بنیاد انفرادی احساسات، تجربات اور ہم عصر حقیقت کے براہ راست تجربہ کرنے اور برتنے کی انفرادی کوششوں پر ہے۔ ''جدیدیت'' کسی ایک فکری دھارے کا نام نہیں بلکہ اس میں بہت سے مختلف اور متضاد سمتوں میں بہتے ہوئے دھارے بھی شامل ہیں جو کبھی آگے لے جاتے ہیں اور کبھی پیچھے۔ مثبت اور منفی ردعمل، ''جدیدیت'' ان سب کو قبول کرتی ہے۔۔۔۔۔۔ روایت سے رشتہ قائم رکھنے کے باوجود ہر زمانے کی جدیدیت روایت سے انحراف بھی کرتی ہے۔۔۔۔ روایت سے انحراف کسی روایت کی توسیع بھی بن سکتی ہے اور اس سے مکمل بغاوت بھی۔۔۔۔۔۔ جدیدیت روایت کی توسیع بھی کرتی ہے اور نئی اقدار کی تشکیل بھی۔ ترقی پسند تحریک اپنے زمانے کی جدیدیت ہی کا اظہار تھی۔ جب تک اس تحریک پر انتہا پسندی اور ادعائیت کا غلبہ نہیں ہوا تھا۔ اس تحریک نے جدیدیت کی طرح اپنے اندر مختلف رجحانات اور دھاروں کو سموئے رکھا۔۔۔۔۔۔ آج کی جدیدیت اس

دوسرے دھارے کی توسیع ہے ۔ آج ادب میں جدیدیت دونوں ہی دھاروں کے امتزاج سے عبارت ہے ایک لحاظ سے ہم اسے ترقی پسندی کی توسیع بھی کہہ سکتے ہیں ، کیونکہ ترقی پسندی اپنے وسیع رمفہوم میں ''جدیدیت'' ہی کے عمل کی نشان دہی کرتی ہے ۔۔۔۔۔ جدیدیت ادب کے اس عرفان کے ساتھ یقیناً ترقی پسندی سے اگلا قدم ہے ۔ ترقی پسندی نے فرد پر سماج کو اور انفرادی احساس پر اجتماعی شعور کو اس قدر غالب کر دیا تھا ۔۔۔۔ ''جدیدیت'' اس ردعمل کے اظہار سے ہمارے ادب کا یا رجحان بن کر سامنے آئی ۔۔۔۔ جدیدیت نہ صرف ترقی پسندی کی بہترین روایات کی نگہہ دار ہے بلکہ تمام کلاسکی ادب کی زندہ روایات کی توسیع بھی ہے ۔'' جدیدیت'' تاریخ کے اس لمحے کے عرفان کا نام ہے جو ہمیں ملا ہے جسے ہم بھگت ہی نہیں رہے ہیں بلکہ اس کے عمل میں حصہ دار بھی ہیں یہ لمحہ محدود نہیں ۔ خلاء میں لٹکا ہوا نہیں بلکہ اس کا ایک سرا ماضی تک پہونچتا ہے اور دوسرا مستقبل کی نشان دہی کرتا ہے ۔'' [1]

۱۹۶۱ء کے بعد سے آج تک اُردو ادب پر جدیدیت کا رجحان غالب رہا ہے لیکن اس کو سمجھنے کی بات دراصل یہ ہے کہ ہر تخلیق اپنے فن کار، ماحول اور ذریعہ اظہار کے تصادم سے جنم لیتی ہے جس میں فن کی بنیادی اقدار کو خاص اہمیت حاصل ہے ۔ زندگی چونکہ ایک نامیاتی حقیقت ہے اور فن اس نامیاتی حقیقت کا مظہر، اس لئے فن کا عکس یا اس کا پرتو کبھی ماضی، کبھی حال اور کبھی مستقبل کا آئینہ دار ہوگا یا بہ الفاظ دیگر ان تینوں زمانوں کو فن کے آئینے میں دیکھ سکتے ہیں ۔ روایت، فن اور تجربہ کا نقطۂ آغاز ہے ۔ روایت کے بعد انفرادیت کی منزل آتی ہے ۔ انفرادیت کے بعد جدّت، اسی جدّت کے تقاضے میں ترقی پسند تحریک شروع ہوئی اور جدّت کے بعد بغاوت کا دائرہ عمل شروع ہوتا ہے ۔ روایت کے اسی پیچیدہ اور تخلیقی سفر کے محاصل کا نام ''جدیدیت'' ہے ۔ لیکن جس طرح ترقی پسند تحریک نے انتہا پسندی اپنالی تھی اور اپنے سے پہلے کے ادب کو بے کار اور تفریح کا ذریعہ کہہ کر ٹال دیا تھا اسی طرح جدیدیت بھی انتہا پسندی کا شکار ہوگئی ۔ جدیدیت سے متاثر شاعروں اور ادیبوں نے پورے ترقی پسند ادب کو نعرہ بازی کہہ کر نظر انداز کر دیا اور اس سے مخالف

---

[1] وحید اختر، ڈاکٹر ۔ ''جدیدیت کے بنیادی تصورات'' مشمولہ ۔ فلسفہ اور ادبی تنقید ۔ صفحہ نمبر ۱۵۲ / تا ۱۹۲

رجحانات کو اپنانا شروع کیا ابتداً جدیدیت کے اس رجحان کو ان شعراء نے اپنایا جو ترقی پسند تحریک سے وابستہ تھے اور چند ایسے شعراء بھی شامل تھے جنہوں نے ترقی پسندی اور جدیدیت کے مثبت اقدار کا اپنی شاعری میں ایک ساتھ اظہار کیا۔ ان شعراء میں فیضؔ احمد فیضؔ، احمد ندیمؔ قاسمی، علی سردار جعفری، جاں نثار اخترؔ، اختر الایمان، مخدومؔ محی الدین، خورشید الاسلام، مجید امجدؔ، عمیقؔ حنفی، وحید اخترؔ، خلیل الرحمٰن اعظمی، مغنی تبسمؔ، شاذؔ تمکنت، شہر یارؔ، بلراج کومل، راشد آذرؔ، باقرؔ مہدی، عزیز قیسیؔ اور بشرؔ نواز وغیرہ خاص طور پر اہم ہیں۔

نتیجتاً اب اس بات کا احساس غالب ہے کہ ترقی پسند تحریک اور جدیدیت کے بعد جس ادب نے اپنی جگہ بنائی وہ ان دونوں کی ملی جلی کیفیات کا مرقع ہے۔

☆☆☆